اردو میں تھیوری شناسی : ایک تاریخی زاویہ

سعادت سعید [1]

Abstract:

"It has been revealed so many times in contemporary Urdu Criticism that the discussions about Western Theories have begun after 1970. Historically it is not true. The writer of this article claims that discussions on various modern theories were also in the air of Urdu literature before 1970. Its credit goes to New Poetry group in Urdu. Some new critics belong to this group brought critically into discussions various concepts of Modernism, Marxism, Existentialism, Logical positivism, Linguistics Studies, Colonial Thoughts and New Philosophical perspectives of New Colonial Knowledge."

شاعری الفاظ اور تخیل کے باہمی امتزاج سے صورت پذیر ہوتی ہے۔اس میں شاعر اپنے احساسات اور جذبات کو بطریق احسن سمونے کی کوشش کرتا ہے۔اس عمل کے دوران زبان کی کئی صورتیں سامنے آتی ہیں۔یعنی شاعر اپنی اظہاری ضرورت کے مطابق سادہ زبان کے استعمال سے لے کر پرتصنع زبان کے استعمال تک زبان کے کسی بھی طور کو منتخب کر سکتا ہے۔چونکہ تا حال شاعر نے لفظی اصوات پر انحصار کر رکھا ہے اس لیے خالص صوتی شاعری یعنی سروں کے اتار چڑھاؤ سے پیدا ہونے والے جذباتی اور احساساتی سلاسل کے دروازے اس پر بند رہے ہیں۔اس تناظر میں شاعری میں خیال کی بندشوں کے لیے شعر میں استعمال ہونے والے فنی ذریعوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔عہد جدید کے ماہرین ریاضیات نے اگرچہ یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ ریاضی اپنی انتہا کو پہنچ کر شاعری ہو جاتی ہے تاہم اس کی اس خالص سطح کی شناخت پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔یہ خالص سطح تجریدِ محض کی سطح ہے اور شاعری میں تجرید کی کئی دوسری صورتیں تو بار پاتی دکھائی دیتی ہیں لیکن اس کی انتہائی صورتوں سے کوئی سروکار نہیں رکھا گیا۔شاعری میں تلمیح، رمز، کنایہ، اشارہ، تشبیہ، تمثیل،استعارہ، علامت،اسطورہ کا استعمال تجریدی اظہار سے نسبت رکھتا ہے۔یہ سب وسیلے احساس، فکر اور جذبے کی تجریدی صورتوں کو ٹھوس کے دائرے میں لانے کا کام کر سکتے ہیں۔علاوہ ازیں شاعری کو شکل دینے والے دیگر وسائل میں اس کی مختلف ہیئتیں بھی بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔

عصر حاضر میں ساختیاتی اور مابعد ساختیاتی نظریوں نے جس نوع کے مباحث چھیڑے ہیں ان میں ساخت، گرامر ، قاعدے اور بنیاد کو اہمیت حاصل ہے۔یہ نظریے فنی اور فکری سطحوں پر ان ساختوں یا نو ساختوں کو زیر بحث لاتے ہیں جو کسی علم ، زبان یا فن کی بنیاد میں مخفی ہوتی ہیں۔یہ ساختیں اور نو ساختیں طبیعیاتی، حیاتیاتی، نباتیاتی، فکریاتی اور تخیلاتی سلاسل کا جزو لاینفک ہوتی ہیں۔یوں یہ سلسلے مخصوص بناوٹوں کے امین ٹھہرتے ہیں۔اسی طرح زبان میں گرامر کے بنیادی اصولوں کی پاسداری ایک مخصوص نوع کی ابلاغی زبان کا رستہ استوارکرتی ہے۔یہ تمہید بندی اس لیے کی گئی ہے کہ میں آپ کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرواؤں کہ ان دنوں جس جدید تھیوری کا ہر کس و ناکس گرویدہ ہے یہ مباحث ساٹھ کی دہائی میں افتخار جالب ، اورانیس ناگی نے اور ستر کی دہائی میں راقم الحروف اور نزہت الماس نے اپنے مضامین اور مقالوں میں بخوبی شامل کیے تھے۔اس حوالے سے جہاں افتخار جالب کی مرتبہ کتاب ''نئی شاعری'' اور انیس ناگی کی کتاب''تنقید شعر'' نے اپنا کردار ادا کیا تھا وہاں انہی دنوں یعنی ۱۹۶۹ء میں راقم الحروف کا مقالہ ''اردو نظم میں جدیدیت کی تحریک'' لکھا گیا تھا ،اور ۱۹۷۰ء میں سیدہ نزہت الماس کا مقالہ ''جدید اردو نظم میں وسائل اظہار'' سپرد قلم کیا گیا تھا۔علاوہ ازیں ان سے قبل ایم اے اردو کے دو مقالے ''سرود نو سے استانزے تک'' از انیس ناگی اور ''جدید اردو نظم میں علامت

---

[1]ممتاز پروفیسر، جی سی یونیورسٹی، لاہور

نگاری‘‘ از تبسم کاشمیری بھی لکھے جا چکے تھے۔ میراجی پر انوار انجم کا مقالہ بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ان حوالوں کا تذکرہ اس لیے ضروری ہے تا کہ اس بات کا تاریخی تعین ہو سکے کہ جدید تھیوری کے اہم ترین سلاسل کے اولین نمونے مذکورہ کتب اور مقالوں میں نظر آتے ہیں۔ اس امر پر میں افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے فی زمانہ مشہور نقاد نئی شاعری کی تحریک سے دانستہ اغماض برتتے ہیں کہ کہیں ان معاملات پر ان کی اولین حیثیت برقرار رہے۔اس حوالے سے گوپی چند نارنگ، شمس الرحمن فاروقی اور شمیم حنفی بھی ایک گونہ تعصب کا شکار رہے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ نصابی ضرورتوں کے تحت لکھی گئی کتابوں میں نئی شاعری کی تحریک کے فنی اور فکری پہلوؤں کو دانستہ نظر انداز کیا گیا ہے۔

نئی شاعری پر افتخار جالب،انیس ناگی، تبسم کاشمیری، جیلانی کامران، راقم الحروف اور نزہت الماس[1] کی تحریروں پر توجہ اس امر کی نشاندہی کو ممکن بنا دے گی کہ اس تحریک کے اعماق کو سمجھنا دو اور دو چار کا ورد کرنے والے نصابی نقادوں کے بس کی بات نہیں تھی ۔اس لیے انہوں نے یا تو کلاسیکی شعر و ادب پر مضامین لکھنے میں عافیت جانی یا اگر وہ جدید دور کی طرف پلٹے بھی تو سیدھے سادے شعر کہنے والے شاعروں کو موضوع اظہار بنانے کا سہل پسندانہ کام کرتے رہے۔نئی شاعری اور نیا افسانہ جس نوع کے لسانی تجربات سے متعلق ہیں سادہ بیانیوں اور سادہ خیالوں کے عادی ناقدین کی ان تک پہنچ نہ ہونے کے برابر ہے۔ سیدہ نزہت الماس کا مقالہ جدید اور نئی شاعری کی فنی تفہیم کی جانب ایک اہم قدم کی حیثیت سے پرکھا جانے کے قابل ہے۔

نزہت الماس کا مقالہ ’’جدید اردو نظم میں وسائل اظہار‘‘ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں اس تناظر میں علم بیان کی کلاسیکی روایت سے کافی حد تک مختلف رویہ اپنایا گیا ہے۔شعر کلاسیکی ہو یا جدید اس میں اظہار کے قدیم و جدید وسیلوں ہی سے کام لیا جاتا ہے۔یہ کتاب اس امر سے پہلو تہی نہیں کرتی البتہ یہ ضرور ہے کہ اس میں اردو میں معریٰ اور آزاد نظم کے مختلف ادوار میں استعمال ہونے والے نئے وسائل اظہار سے بھی گہرا ربط رکھا گیا ہے۔اس میں وزن، ہیئت، تمثال اور علامت کے حوالوں سے انگریزی شعری روایات سے استفادہ کیا گیا ہے۔اس کتاب میں اظہار کے معاملے کو اس کی فلسفیانہ جہتوں سمیت گرفت میں لیا گیا ہے۔اس نازک مسئلے پر جس گہرے انداز میں کروچے نے اظہار خیال کیا ہے کہ اظہار تو فی بطن شاعر مکمل ہو جاتا ہے ۔اس کا لفظی یا کسی اور میڈیم میں بیان یا عکس ترجمانی کے ذیل میں آتا ہے۔یوں شاعر بہت کچھ کہنے کے باوجود یہ محسوس کرتا ہے کہ بہت کچھ ان کہا بھی رہ گیا ہے۔یعنی شاعر اپنے سینے کے آتشکدے کو اظہار میں لانے یعنی اس کی ترجمانی کرنے سے کئی سطحوں پر قاصر رہتا ہے۔

شعر و شاعری کے حوالے سے ازمنہ قدیم سے لے کر عصر حاضر تک ہر زبان میں کئی مباحث دستیاب ہوتے ہیں۔لیکن سخن کے عقدہ لاینحل کی بدولت یہ سلسلہ آج بھی موضوع بحث دکھائی دے رہا ہے۔افلاطون، ارسطو، لان جائینس، الیگزنڈر پوپ، فلپ سڈنی، ولیم ورڈز ورتھ، کالرج، شیلے، کیٹس، بادلیئر، میلارمے ، رامبو، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، ٹی ایس ایلیٹ، ایذرا پاؤنڈ ، جان کرو رین سم، سوسن کے لینگر، جان پریس، سی ڈی لیوس، سارتر، افتخار جالب وغیرہ نے اپنے اپنے عہد میں شاعری کا وہ تصور پیش کیا ہے جو ان کے ارد گرد موجود مسائل و معاملات کو سمجھنے اور سمجھانے کا پیش خیمہ بھی بنا ہے۔ نزہت الماس نے شاعری کے بارے میں جن چند نظریات کو پیش کیا ہے ان سے شاعری کی ماہیت کو سمجھنے میں مدد ملی ہے۔اس تناطر میں انہوں نے شاعرانہ خیال، زبان،علامت،تمثال،آہنگ، ہیئت، ابلاغ و ابہام کے شعری وسائل کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ اپنی تحقیقی مساعی کے حوالے سے وہ کہتی ہیں:

> ’’جدید اردو نظم میں وسائل اظہار کا موضوع بڑی وسعت کا حامل ہے۔ یوں کہیے کہ نظم میں اظہار کے ہر وسیلے کی کل بنیادوں کو پیش کرنے کے لیے علیحدہ علیحدہ مقالوں کی ضرورت ہے۔ میں نے شاعری میں اظہار کے وسیلے کے بنیادی نقوش ابھارنے کی کوشش کی ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ نقوش ابھی تک تکمیل کی حسرت لیے ہوئے ہیں اور جب تک جذبے ،تجربے اور تخلیق کی قوتیں زندہ ہیں، ناقد شعر کو تشنگی کا احساس رہے گا۔ یوں بھی

جدید اردو نظم میں وسائل اظہار کے موضوع پر بہت کم مواد ملتا ہے۔ اب تک اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا زیادہ تر حصہ اردو تنقید کی علم روشنی کی طرح تحسین یا تنقیص تو کرتا ہے لیکن تنقیدی اور فنی بصیرت کا احساس پیدا نہیں کرتا۔میں نے جدید اردو نظم میں وسائل اظہار کے موضوع پر اپنی بساط کے مطابق روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن مقالے میں خامیوں کی موجودگی عین ممکن ہے۔ میں امید کرتی ہوں کہ مندرجہ بالا صورت حال کے پیش نظر قارئین میری خطاؤں سے درگزر کریں گے۔''(۲)

مقالہ نگار نے ''جدید اردو نظم میں وسائل اظہار'' کے تناظر میں جو تحقیقی کام کیا ہے وہ اس لیے بھی قابل صد ستائش ہے کہ اس میں اردو نظم کے قدیم ادوار میں وسائل اظہار کی تلاش کا کام بھی منظر عام پر آیا ہے۔عہد قدیم میں علم بیان و بدیع کے قاعدوں کے تحت شاعری میں اظہاری وسائل کا استعمال ہوتا تھا۔تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل، کنایہ، صنائع بدائع کے استعمال سے شاعری کو موثر بنایا جاتا تھا۔عہد نومیں جدید اور نئی شاعری کے لیے ان وسائل اظہار سے بہت کم شغف رکھا گیا ہے۔اس کتاب میں نئے وسائل اظہار کو بنیاد بنا کر انجمن پنجاب کی موضوعاتی شاعری کے ساتھ ساتھ رومانوی شاعری کا بھی جائزہ لیا گیا ہے ۔ اس تناظر میں ان کی یہ رائے ملاحظہ ہو:

''بہت سے ترقی پسند شعرا نے جن میں مجاز، علی سردار جعفری اور فیض وغیرہ بھی جگہ پاتے ہیں، اپنی ابتدائی شاعری رومانی طرز سے شروع کی۔ اس طرح علامت نگار شعرا راشد، مختار صدیقی اور میراجی وغیرہ کی ابتدائی نظموں میں ہلکی پھلکی رومانیت کارنگ ہے۔رومانی شعرا کے ہاں پہلے کے شاعروں کی نسبت نظم زیادہ تخلیقی انداز سے استعمال ہوئی۔ لیکن یہ شاعر بھی بیانیہ اور وضاحتی انداز کی وجہ سے اختصار، جامعیت اور وہ پر زور اور بھرپور تاثر پیدا کرنے سے قاصر رہے جو نظم کا بنیادی وصف ہونا چاہیے۔ ان شعرا نے مواد کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ہیئت کے تجربے بھی کئے جو انگریزی ہئیتوں کی میکانکی تقلید کی وجہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ انہوں نے مستقبل میں ہیئت کے تخلیقی اور جاندار تجربوں کے لیے راہ ہموار کردی۔ ان شعرا کی زبان بھی پہلے شاعروں کی نسبت شعریت سے زیادہ معمور ہے۔ انہوں نے تشبیہ واستعارے کے منصب کو سمجھا اور شاعری میں احساسات کی براہ راست عکاسی کے بجائے اس میں جذبے اور احساس کے رنگوں کو شامل کیا۔''(۳)

ترقی پسند شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے مصنفہ اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ اس تحریک کے شعرا نے علامتوں، تمثالوں، براہ راست بیانیوں اور ہیئتوں کا استعمال بڑی چابکدستی سے کیا ہے۔نئے شعری وسائل اظہار کا سراغ لگانے کے لیے محمد دین تاثیر،فیض احمد فیض،احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری، اسرار الحق مجاز لکھنوی، ظہیر کاشمیری، جانثار اختر، مخدوم محی الدین ،معین احسن جذبی، مصطفیٰ زیدی، عارف عبدالمتین کی شاعری کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اور اس امر کی نشاندہی کی گئی ہے کہ ترقی پسند شاعری میں جہاں جدید وسائل اظہار سے کام لیا گیا ہے وہاں اس میں موجود نظری حوالوں کی کاٹ اور تاثیر زیادہ ہو گئی ہے۔ترقی پسند شاعروں نے معریٰ اور آزاد نظموں میں موضوعات کی مناسبتوں سے ہیئتوں اور اوزان کا استعمال کیا ہے اور اپنے براہ راست بیانیوں میں بھی تلازموں اور مناسب لفظی آہنگوں سے اثر انگیزی کی کیفیتیں پیدا کی ہیں۔نزہت الماس اس حوالے سے یہ بھی نتیجہ نکالتی ہیں:

''بیشتر ترقی پسند شعرا نے نظم کو مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ ان کی نظمیں اظہار کے اختیاری عمل سے تعلق رکھتی ہیں۔ اظہار کے اختیاری عمل میں اقتصادی، اخلاقی اور فکری تصورات اغراض و مقاصد سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اغراض و مقاصد کی ترسیل فنکار کو توضیح اور بناوٹ کا سہارا لینے پر مجبور کرتی ہے۔ حالی تحریک اور بعض ترقی پسند شعرا کی مقصدی نظمیں اس زمرے میں آتی ہیں۔ تخیلی، علامتی، تمثالی اور استعاراتی برجستگی ان شعرا کے ہاں کمیاب ہے۔ مواد اور معانی کے ارادی انتخاب نے ان میں بعض شعرا کو صناع یا کاریگر تو ضرور بنا دیا ہے۔ لیکن شاعری کی اعلیٰ وارفع اور آفاقی قدریں ان کی نظموں کے کینوس سے غائب ہوتی نظر آتی ہیں۔ ترقی پسند شعرا نے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے زیادہ تر عام فہم اور روزمرہ زبان سے کام لیا ہے۔ الجھاؤ، ابہام اور غیر مربوط

اظہار کا عمل ان کے ہاں نہیں ہے۔ وہ جس موضوع کا اظہار کرنا چاہتے تھے، سیدھے سادے لفظوں ،براہ راست انداز اور یک سطحی علامتوں اور تمثالوں میں کر دیتے تھے۔ ان کے ہاں بسا اوقات سپاٹ انداز بیان غالب آ گیا ہے۔‘‘(۴)

’’جدید اردو نظم میں وسائل اظہار‘‘ کا سب سے اہم باب ’’علامت پسندی کی تحریک اور اس کے اہم علمبردار‘‘ ہے ۔یہ باب قیام پاکستان سے قبل اور مابعد کے علامت پسند شاعروں کی شاعری کو نئے اظہاری وسیلوں کی مدد سے سامنے لاتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ انجمن پنجاب ، رومانوی دبستان شعراور ترقی پسند تحریک کی شاعری کے مقابلے میں آزاد نظم کے حامی علامت پسند شعرا کی شاعری اردو نظم کے ارتقائی سفر میں ایک ایسے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ جس کے بعد اردو میں نظمیہ شاعری کے اور کئی سلاسل سامنے آئے ۔اس تناظر میں نئی شاعری اور نثری نظم کی شاعری کو بھی مد نظر رکھا جا سکتا ہے۔

مقالہ نگار نے’’جدید اردو نظم میں وسائل اظہار‘‘ میں ن ۔م راشد، میرا جی، تصدق حسین خالد، مختار صدیقی، قیوم نظر، یوسف ظفر، ضیا جالندھری، اخترالایمان،مجید امجد،عزیز حامد مدنی، محمد صفدر، وزیر آغا اورمنیر نیازی کی شاعری کا اس اعتبار سے عمدہ جائزہ لیا ہے کہ ان کے شعری مجموعوں میں استعمال ہونے والے اظہاری وسائل کی افادیت کھل کر سامنے آئی ہے۔ان شعرا نے مغربی طرز کی جدید شاعری سے بھر پور استفادہ کیا ہے۔یہ کتاب ۱۹۷۰ء تک کی جدید اور نئی شاعری کے جائزے پر مشتمل ہے ۔لیکن اس میں ستر کے بعد ہونے والی ان نوجوان شعرا کی شاعری کا بھی ذکر ہے کہ جو اکیسویں صدی کے متعدد سالوں میں بھی سر گرم عمل دکھائی دیتے ہیں۔یوں یہ کتاب اگرچہ نثری نظم کے شعرا کے تذکرے سے نسبت نہیں رکھتی لیکن اس میں نئی شاعری اور اس کے زیر اثر وجود میں آنے والی شاعری کا تذکرہ بھی دستیاب ہے۔

سن ستر تک ہونے والی نئی نسل کی شاعری میں وسائل اظہار کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنفہ نے افتخارجالب، جیلانی کامران، عباس اطہر، انیس ناگی،سلیم الرحمن،اختر احسن،اعجاز فاروقی،زاہد ڈار،تبسم کاشمیری، محمود شام،آفتاب اقبال شمیم، راجہ فاروق حسن کی نظم نگاری کو بھی اپنے تنقیدی تجزیوں کا حصہ بنایا ہے۔ ان شاعروں میں سے آج افتخارجالب، جیلانی کامران، عباس اطہر، انیس ناگی،اور راجہ فاروق حسن اس دنیا میں موجود نہیں ہیں تاہم باقی شعرا میں سے سلیم الرحمن،اختر احسن،زاہد ڈار،تبسم کاشمیری،محمود شام اورآفتاب اقبال شمیم بدستور نظمیں لکھ رہے ہیں۔ان نظموں میں ان کا علامتی، تمثیلی اور استعاراتی طرز بیان بدستور پر تاثیر ہے۔

’’جدید اردو نظم میں وسائل اظہار‘‘ کے آخر میں مقالہ نگار نے ایک نتائج خیز محاکمہ بھی تحریر کیا ہے۔ اس میں ایک مقام پر وہ لکھتی ہیں:

’’۱۹۶۸ءسے کے بعد ابھرنے والی نئی نسل کی نظمیں اس لحاظ سے حوصلہ افزا ہیں کہ بعض شاعروں نے خاندانی، معاشرتی، ملکی اور بین الاقوامی زندگی کے انتشار اور منفی اقدار سے اکتا کر شاعری میں مثبت قدروں کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ احمد شمیم،فہمیدہ ریاض ،امجد اسلام امجد، سہیل احمد، فہیم جوزی اور سعادت سعید کی نظمیں اس سلسلے میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ جیلانی کامران نے ماہنامہ شام و سحر ستمبر ۱۹۷۰ءسے کے شمارے میں چند شعرا کو ایک نئی شعری تحریک کے بانی قرار دیتے ہوئے ان کی مثبت شعری قدروں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جابر علی سید فنون (ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۰ءسے)میں رقم طراز ہیں۔’’غزل اب ہر لحاظ سے دبی دبی سی معلوم ہوتی ہے اور طاقت کے اس خلا کو نظم بآسانی پر کر رہی ہے۔ نظم کی اس جہت میں حصہ لینے والے فہمیدہ ریاض، امجد اسلام امجد، سہیل احمد اور سعادت سعید ہیں اور اس ریلے ریس کیFinishing فنون کے دو آخری شمارے ہیں جن میں نظم کی ہر ہیئت مختصر، متوسط ،پابند، طویل سب نے برابر حصہ لیا ہے۔ جدید تر نظم اب موضوع پر نہیں موضوع کے اندر لکھی جاتی ہے۔‘‘ جابر علی سید نے نئی نسل کے ان شعرا کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے مزید لکھا ہے۔’’ سہیل احمد کی زرد کتاب کی پہلی نظم میں کل ۲۱ مصرعے ہیں اور کل ۲۱ قافیے (بارشوں، معبدوں، لفظوں، مکانوں) لیکن شاعر پر مرصع کاری کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ سہیل احمد کے قافیے قافیے بعد میں ہیں اور شیا

اور مناظر پہلے۔ فہمیدہ ریاض، سہیل احمد، امجد اسلام امجد اور سعادت سعید کی نظموں میں دو توجہ طلب عنصر اور بھی ہیں۔ یاد ماضیNostalgia اور بین الاقوامیت۔ یاد ماضی کا نمائندہ لفظ رفتگاں ہے۔ جو فراق سے ہوتا ہوا ناصر کاظمی، احمد مشتاق، فہمیدہ ریاض اور سہیل احمد تک پہنچا ہے۔ فہمیدہ ریاض کی نظم تصویر میں یہ بڑی چابک دستی سے مضمر ہے۔ بین الاقوامیت ظہیر کاشمیری کے بین الاقوامی تصور سے مختلف مقصد ،ہیئت اور آہنگ رکھتی ہے۔ بین الاقوامی میں یہ خارجی اور تہذیبی ہے اور نئے نظم نگاروں کے ہاں داخلی اور حسیاتی۔ مندرجہ بالا شاعر نظم کے سانچوں کو تخلیقی طور پر استعمال کرنے پر قادر ہیں یا نہیں یہ علیحدہ بحث ہے لیکن ان کی نظموں کے مطالعے سے اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ یہ شاعر شعری اظہار کے ذریعے صداقتوں اور حقیقتوں کی تلاش میں مصروف ہیں۔ ان کی علامتوں میں زندگی بخش قدروں کی نشان دہی ہو سکتی ہے۔ ان کی تصویریں معاشرے کی مجرمانہ ذہنیت، تعیش پسندی، شر انگیزی اور غیر فطری صورت حال سے ان کی اکتاہٹ کی عکاس ہیں۔ ان شاعروں نے آزاد نظم کے وسیلے کو اپنا کر شاعری میں دوبارہ مسلسل اور منظم اظہار کا سنگ بنیاد رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے تجربے اور واردات ان کے حواس، شخصیت اور ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کو مرکزی حیثیت عطا کر کے اپنے بحران کو آفاقی اور اجتماعی تناظر میں رکھ کر دیکھتے ہیں یوں ان کی علامتیں ذاتی یا نجی نہیں رہتیں اجتماعی اور آفاقی ہو جاتی ہیں۔‘‘(۵)

’’جدید اردو نظم میں وسائل اظہار‘ ‘ کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ شاعروں کے تجربوں کا منبع ان سے متعلق خارجی دنیا ہے ۔وہ اس دنیا کے پس منظر میں ماضی اور مستقبل کے مابین سفر کرتے رہتے ہیں ۔اس حوالے سے کہیں نوسٹیلجیا اور کہیں امکانی تصورات ان کی شاعری کا حصہ بنتے ہیں۔علاوہ ازیں شاعر کے داخلی لہجے اس کی خارجی ہیئتوں کو متعین کرتے ہیں اور اس کے موضوعات پر اس کے ماحول اور زمانے کے تقاضے اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ اردو نظم کی قدیم روایات اور جدید اجتہادات کا مطالعہ اس امر کی نشاندہی کر رہا ہے کہ عصری سماجی تقاضے اور نظری و فکری احتیاجات شاعری میں نئے اظہاری سانچوں کوفروغ دینے کا باعث بنتے ہیں ۔اردو شاعری کی تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جو ادبی وسائل اظہار میں تبدیلیاں پیدا کرنے کا کام کرتے ہیں شاعر کے داخلی اور خارجی زندگی کے تغیرات سے گہرے طور پر مربوط ہوتے ہیں۔اردو نظم نے بیسویں صدی میں جس تیزی سے ترقی کی ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ انجمن پنجاب سے وابستہ شاعروں سے لے کر نئی لسانی تشکیلات کی تحریک اور اس کے مابعد کے شعرا تک عہد اور زمانے کے تقاضوں کو مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے ۔اس دور کی شاعری اپنے اپنے عہد کے انسان کی ضروریات سے ہم آہنگ ہو کر وقتا فوقتا وسائل اظہار کے ضمن میں بھی ارتقا ئی منزلیں طے کرتی رہی ہے۔

۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک کے تاریخی، سیاسی، سماجی، تعلیمی اور ثقافتی ماحولوں کی روشنی میں سرسید تحریک، انجمن پنجاب کی تحریک، رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک، آزاد نظم کی تحریک اور نئی شاعری کی تحریک کو مصنفہ نے اجتماعی، معاشی، معاشرتی،سیاسی،فکری اور جذباتی رویوں کی روشنی میں پرکھا ہے۔ اس حوالے سے ان کا یہ تجزیہ بھی قابل تحسین ہے :

’’ جنگ آزادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل اور نئی انگریز حکومت کی تعلیمی اور انتظامی پالیسیوں کے اثرات نے اجتماعی زندگی کے قرینوں کو بڑی حد تک بدل دیا تھا۔ اس صورت حال میں فن، ادب اور علم کے میدانوں میں بھی تغیرات ناگزیر تھے۔ انگریزوں نے جنگ آزادی کا تمام تر ذمہ دار مسلمانوں کو ٹھہرایا اور ان پر طرح طرح کے مظالم ڈھانے شروع کئے ۔مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیاں دور کرنے اور نئی حکومت سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے سر سید احمد خان کے زیر اثر قومی اور مقصدی ادب کی تخلیق ہوئی۔ نئے ماحول نے زندگی کو دیکھنے کے قدیم تصورات پر کاری ضرب لگائی چنانچہ ادب کی پرانی تکنیکیں اور ہیئتیں جو نئے زمانے کاساتھ دینے سے قاصر تھیں اپنی مقبولیت کھونے لگیں۔ غزل کی ریزہ خیالی کی جگہ نظم کی منظم اور مسلسل سوچ نے لے لی۔ ادیب ماورائی

اور خیالی دنیا سے کنارہ کش ہوا اور اپنا مواد حقیقی زندگی میں ڈھونڈنے لگا۔ اجتماعی انتشار نے شعرا اور ادبا کو اجتماعی ذمہ داری کا تصور بخشا۔‘‘(۶)

ذیل میں جدید اردو نظم کے ارتقا کے حوالے سے مقالہ نگارکے چند تصورات ملاحظہ ہوں:

1. انجمن پنجاب کے زیر اثر نیچرل شاعری کو فروغ ملا۔ حالی، آزاد، اسماعیل میرٹھی اور بہت سے دوسرے شعرا نے اپنی نظموں میں فطری زندگی سے اخذ شدہ مناظر کو عام فہم سادہ ،براہ راست زبان سے حاصل شدہ ، تمثالوں اور تشبیہوں میں پیش کرنا شروع کیا۔
2. ۱۹۰۰ء کے بعد جو رومانوی تحریک سامنے آئی وہ انگریزی تعلیم کے عام چرچے اور نئے یورپی علوم کی آمد کا نتیجہ تھی۔اس تحریک کے شعرا نے انسان اور معاشرے کو نئے اور گہرے انداز سے سمجھا۔ رومانی تحریک نے عقلیت اور خارجی منظر نگاری کے رویوں کو خیر باد کہااور شاعر کی جذباتی اور احساساتی زندگی کے تقاضوں کو شاعری کا حصہ بنایا۔ رومانوی شعرا نے شاعری میں ایسی ہیئتیں استعمال کیں جو بعد ازاں آزاد نظم نگاری کے لیے راہیں ہموار کر گئیں۔اس دور میں اردو شاعری میں ہندی پنگل اور انگریزی اوزان کوبھی جگہ ملی ان شعرا نے وزن ،آہنگ، تمثال، استعارہ ،تشبیہ اور علامت وغیرہ کی وحدت اور تنظیم سے سروکار رکھا۔
3. ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا ڈول ڈالا گیایوں اردو نظم میں بھی معاشرتی، معاشی، قومی اور ملکی مسائل کا بیان زیادہ شدت سے ہوا۔ وہ معاشی اور سیاسی استحصال کے معاملات کو تمثالوں اور علامتوں کے وسیلے سے پیش کرتے رہے ۔ جاگیردارنہ اورنئے ابھرتے سرمایہ دارانہ نظاموں کے زیر اثر سامنے آنے والے معاشی استحصال اور سیاسی غلامی کے خلاف ان کا شعری رد عمل شدید تھا۔

   ’’ یہ شعرا معاشرتی بحران میں یاسیت ، ناامیدی، خوف، لاتعلقی، فرار،بے یقینی اور تشکیک کے رویوں کو مرکزی اہمیت نہیں دیتے بلکہ رجائی انداز میں امید جرأت، وابستگی، نشاط، یقین اور خوش آئند مستقبل کے احساسات نظم کرتے ہیں۔‘‘(۷)
4. علامتی شاعری میں نئے سائنسی اور فکری علوم اور نئے معاشرتی، سیاسی اور معاشرتی فلسفوں سے مدد لی گئی۔اس دور میں علامت پسند شعرا فرائیڈ، یونگ، ایڈلر، جیمز جوائس، ڈی۔ ایچ لارنس، ٹی۔ ایس ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ سے فنی و فکری کمک لیتے رہے۔ امیجسٹ تحریک کے ساتھ ساتھ سورئیلی انداز فکر سے بھی ربط رکھا گیا۔ بادلیر، میلارمے اور رمبو سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ یہ شعرا آزاد تلازمات کی تکنیک کو بھی برتنا پسند کرتے تھے ۔ان کی نظموں میں محبت، نفرت ،مذہب ،تقدیرا ور موت وغیرہ کے موضوعات دستیاب ہیں اس دور میں دیومالائی حوالوں کو بھی کثرت سے استعمال کیا گیا۔
5. ۱۹۴۷ء میں پاکستان وجود میں آیا ۔مگر اس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر فسادات ہوئے ان کا تذکرہ کئی پاکستانی شعرا کی نظموں میں ہوا ۔ان کی شاعری میں شدید کرب اور انتشار ملتا ہے۔ اس دور کی جدید نظمونمیں تاثراتی اور علامتی رنگ نمایاں ہے۔سماجی جلاوطنی کے تاثرات اور تصورات کوکئی شعرا نے ہندی آمیز اردو، فارسی آمیز اردو اور روز مرہ اردو پر مشتمل تمثالوں اور تصویروں میں پیش کیا۔
6. ۱۹۵۵ء کی پیچیدہ معاشرتی صورت حال کو نئے شاعروں نے اپنی داخلی اور شخصی زندگی کی الجھنوں سے ہم آہنگ کر کے نظم نگاری کی۔ ان کی نظموں میں معنوی اور ہیتی تبدیلیاں موجود ہیں۔یہ شعرا اپنے عہد کے لسانی، سماجی اور فکری بنیادوں پر سامنے آنے والے فلسفوں سے بخوبی واقف تھے۔انہیں الجھی ہوئی تمثالوں اور بکھرے ہوئے استعاروں سے نسبت تھی وہ اپنی منتشر ذہنی کو منتشر علامتوں میں پیش کرنے کا اہتمام کرتے تھے ۔وہ نئی لسانی تشکیلات کے زیر اثر نئے لسانی پیرایوں میں بات کرنے کے عادی تھے۔
7. نئی گلوبل صورت حال اور نئی تھیوریز کو لسانی تشکیلات کو معنوی تشکیلات تک لانے والے شاعروں نے اپنی نظموں میں جگہ دی۔اس تناظر میں وجودیت اور مارکسزم کے امتزاج سے انہوں نے اپنے عہد کی صورت حال کو ذاتی انتخاب، ذمہ داری اور آزادی کی روشنی میں

پرکھا اور نئے آزاد انسان کے نظریات و تصورات کا پرچم بلندکیا۔انہوں نے جدید صنعتی معاشروں میں موجود صارفیتی رویوں اور میکانکی سوچوں کو چیلنج کیا اور شاعری میں لامعنویت کے تصورات کو نئی معنویت سے بدلنے کی کوشش کی۔انہوں نے اگر خوف ،دہشت، انسانی بے قدری، خود غرضی، استحصال ،خود حفاظتی، بے اطمینانی اور انتشار کو اپنی شاعری کا موضوع بھی بنایا ہے تو ایک واضح معنویت بھی ان کو نئے رستوں کا ہم سفر بناتی رہی ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ اس حوالے سے ملاحظہ ہوں:
افتخار جالب کی مرتبہ کتاب ''نئی شاعری'' ، انیس ناگی کی کتاب''تنقید شعر''
سعادت سعید ،اردو نظم میں جدیدیت کی تحریک،۱۹۶۹ء(مقالہ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی ،لائبریری)
سیدہ نزہت الماس،جدید اردو نظم میں وسائل اظہار(مقالہ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی ،لائبریری)
انیس ناگی،سرود نو سے استانزے تک(مقالہ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی ،لائبریری)
محمد صالحین (تبسم کاشمیری)،جدید اردو نظم میں علامت نگاری،(مقالہ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی ،لائبریری)
انوار انجم ،میرا جی،(مقالہ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی ،لائبریری)

۲۔ نزہت الماس،جدید اردو نظم میں وسائل اظہار،مقالہ ایم اے اردو ،مملوکہ پنجاب یونیورسٹی ،لائبریری، لاہور، ص ا

۳۔ ایضاً،ص ۶۷، ۶۸

۴۔ ایضاً،ص۲۱۴

۵۔ ایضاً،ص۲۲۲۔۲۲۴

۶۔ ایضاً،ص۲۰۹

۷۔ یہ نتائج زیر بحث مقالے کی بنیاد پر اخذ کیے گئے ہیں۔